عروج وزوال کا فلسفہ: عبرتناک مرقع

بہادر شاہ ظفر کے پوتے مجّی باورچی بن گئے تھے

جو کام توپیں نہ کرسکیں وہ کام مغربی ثقافت نے کر دکھایا

[خواجہ حسن ثانی نظامی نے بہادر شاہ ظفر کے پوتے مجّی کا خاکہ خون دل میں ڈوب کر لکھا ہے۔ اس کا شمار اردو کے چند عمدہ خاکوں میں ہوتا ہے۔ اس ادبی و شخصی خاکے میں قوموں کے عروج و زوال کی پوری داستان سمو دی گئی ہے۔ اس خاکے میں اس عہد کی معاشرت، روایات، اقدار، معاشرے میں بزرگوں کا مقام و کردار، احتساب کی روایت اور نگرانی کے نظام کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ معاشرتی مسائل کو صرف ڈنڈے، نفرت، حقارت اور ردعمل کی منفی نفسیات کے بجائے محبت، رافت، رحمت اور عقل سلیم کے ذریعے حل کرنا چاہیے۔ صرف عقل سلیم نہیں بلکہ ایثار اور قربانی سے حل کرنے کی کوشش تاکہ معاشرے میں پیدا ہونے والا مسئلہ ناسور نہ بنے۔ فطری مطالبات، فطری طریقوں سے حل کیے جائیں۔ یہ خاکہ زوال آمادہ خاندانوں، خانوادے کے مشاغل اور نظام تعلیم و تربیت کے فرد اور معاشرے پر پڑنے والے اثرات کی بھی نقشہ کشی کرتا ہے۔ یہ خاکہ معاشرے میں بزرگوں کی اہمیت بتاتا ہے۔ کیا بزرگ معاشرے میں باقی ہیں؟ ان کا کیا کام ہے اور کیا مقام؟ کیا بزرگوں کے اور جوانوں کے مشاغل میں کوئی فرق ہے؟ کیا بزرگ اپنا وہ کردار ادا کر رہے ہیں جو ان کی ذمہ داری ہے؟ کیا نانی دادی رات کو بچوں کو کہانیاں سنا رہی ہیں؟ کیا مائیں لوریاں سناتی ہیں؟ معاشرے کے ہر فرد کو اپنا ثقافتی کردار کس طرح ادا کرنا چاہیے؟ یہ خاکہ ہمیں اس کا ڈھنگ سکھاتا ہے۔ یہ خاکہ بتاتا ہے کہ تلوار، تیر، بندوق اور توپ بھی وہ کام نہیں کر سکتے جو کام ثقافت انجام دیتی ہے۔ ہر ثقافت اپنی تہذیب کی مابعد الطبیعیات سے طلوع ہوتی ہے۔ مغرب کے خلاف صف آراء اسلامی تحریکوں نے مغربی ثقافت کے مقابلے کے لیے ابھی تک کوئی منصوبہ بندی نہیں کی۔ وہ اسلامی ثقافت کے ذخیرے کو علمی طور پر افضل سمجھنے میں تردد کا شکار ہیں۔ اور اگر اسے افضل و برتر سمجھ بھی لیا جائے تو اسے عملی

طور پر برتنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ اس مخمصے کی انتہا یہ ہے کہ علامہ یوسف قرضاوی عالم عرب میں اور جاوید غامدی پاک و ہند میں مغربی تہذیب وثقافت کی تمام علامتوں اور خباثتوں کو اسلامیانے کی سرتوڑ کوشش کر رہے ہیں۔ ان کا مطمع نظر محض نوجوان نسل کے سفلی جذبات کی بہرصورت تسکین ہے۔ وہ کوئی ایسا ثقافتی ڈھانچے نہیں رکھتے جس سے معاشرے میں علوی جذبات کی افزائش و پرورش کا فریضہ انجام دیا جا سکے۔ یہ صف بستہ، دست بستہ اور لب بستہ مفکرین اسلام کی پوری تاریخ کو طاق نسیاں کی زینت سمجھ رہے ہیں اور کائنات کا آغاز مغرب سے کرنا چاہتے ہیں۔ بحیثیت مجموعی اسلامی ثقافت کی پندرہ سو سالہ قدیم روایات کے احیاء کے لیے سنجیدہ، مسلسل، جامع اور متحرک کوشش ہی نہیں کی گئی۔ ہر کوشش کا آغاز ان مفروضات سے ہوا کہ مغرب کی جانب سے تفریحات کے تمام سلسلے عین اسلامی ہیں۔ اگر ان سے فحاشی اور عورت کو نکال دیا جائے اس نقطۂ نظر کے ذریعے مغرب کی ثقافت کو غیر جانبدار ثقافت تسلیم کر لیا گیا اور اس کے ذریعے اسلامی انقلاب کا صور پھونکنے کی کوشش کی گئی۔ ۱۹۷۰ء کے عشرے میں اسلامی جمعیت طلباء نے ہفتہ طلباء کے پروگرام میں خواجہ معین الدین کے ڈرامے ''تعلیم بالغان'' کے ذریعے ایک ثقافتی تجربہ کیا جس میں صرف ایک خاتون کی آواز پس پردہ آتی ہے لیکن یہ تجربہ بھی برگ و بار نہ لا سکا۔ ایران میں اسلامی انقلاب کے بعد جو تجربات کیے گئے وہ مغربی ثقافت کی اسلام کاری کے تجربے تھے۔ اب تو ایرانی صدر ایرانی موسیقی کو برآمدات کے اہم ترین عنصر کا درجہ دے چکے ہیں۔ اسلام صرف ایک عقیدہ علم تہذیب تمدن طاقت نظریہ مابعد الطبیعیات ہی نہیں وہ دنیا کی طاقت ور ترین ثقافت بھی ہے لیکن یہ ثقافت اب مغربی ثقافت کی اسلام کاری کے ذریعے اپنے وجود کے جواز تلاش کر رہی ہے۔ اسلامی ثقافت میں فنون لطیفہ کی کیا حیثیت ہے؟ وہ واضح ہے لیکن ہم مغرب سے اس قدر مرعوب ہیں کہ مغربی ثقافت کو پیرہن اسلام میں جلوہ گر دیکھنا چاہتے ہیں۔ برقیاتی ذرائع ابلاغ کے ذریعے اسلامی انقلاب برپا کرنے کے تمام تجربے ناکام ہو گئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلامی انقلاب اسلامی طریقوں سے ہی برگ و بار لاتا ہے۔ مرحوم محمود اعظم فاروقیؒ جب وزیر اطلاعات ونشریات تھے تو مرحوم سلیم احمد کے ذریعہ ذرائع ابلاغیات کا قبلہ درست کرنے کی بھرپور کوشش نہایت اخلاص اور ذمہ داری سے کی گئی۔ لیکن آج کوئی ایک فرد بھی ایسا نہیں ملے گا جو یہ بتا سکے یا جسے یہ یاد ہو کہ اس عہد کے ٹی وی میں کیا انقلاب برپا ہو گیا تھا۔ مرحوم محمود اعظم فاروقی اور جماعت اسلامی کا نہایت مخلصانہ خیال یہ تھا کہ حکومت میں سب سے طاقت ور وزارت اطلاعات ونشریات کی ہے اس کے ذریعے ہم نوجوان نسل کے اذہان بدل دیں گے لیکن نتیجہ کیا نکلا؟ فنون لطیفہ کے ذریعے اذہان بدلے جا سکتے تو انبیاء ان فنون کو دین کا لازمی حصہ قرار دیتے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ الہامی تہذیبوں کے مراکز میں ڈرامے کی کوئی روایت نہیں ملتی آخر کیوں؟ اس کیوں کا جواب تلاش کیے بغیر اسلامی ڈرامے کے تجربے کوئی نتیجہ برآمد نہیں کر سکتے۔

جماعت اسلامی نے پاسبان کے ذریعہ انتخابات میں لبرل ثقافت کا بھرپور تجربہ کیا جو بری طرح ناکام ہوا۔ جماعت کی شوریٰ نے پاسبان پر پابندی عائد کردی اور شباب ملی کے نام سے ایک متبادل تنظیم کا اعلان کیا۔ شباب ملی کو آج کوئی نہیں جانتا لیکن پاسبان زندہ ہے۔ثقافتی امور پر سنجیدہ غور وفکر کی ضرورت ہے۔[ساحل]

مجی مرحوم کا خاکہ

مجی مرحوم آخری مغل تاجدار حضرت بہادر شاہ ظفر کی یادگار تھے۔مگر کسے یقین آئے گا کہ ان کی عمر ہنڈیا ڈوئی کرتے گزری۔لال قلعے کا ہونے والا مالک دلی شہر میں باورچی بن کر رہا۔ان کے باپ مرزا ولایت شاہ حضرت ظفر کے ولی عہد کے پوتے تھے۔ولی عہد باپ کے سامنے اللہ کو پیارے ہوئے۔اس لیے ان کی اولاد اس نام چارے کے راج پاٹ کی امیدوار بھی نہ بن سکی جو عظیم مغلوں کا مقدر رہ گیا تھا۔۱۸۵۷ء میں مغل سلطنت کا ٹمٹماتا چراغ بجھا تو اس خاندان کے لیے ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔یہ لوگ غدر کے بعد بستی حضرت نظام الدین میں اٹھ آئے تھے اور افلاس کی زندگی گزارتے تھے۔آمدنی کے ذرائع محدود اور مرزا ولایت شاہ کو افیون کی لت۔بزرگوں کا اثاثہ کب کا خالصے لگ چکا تھا۔بس اللہ ہی تھا جو دن کٹ رہے تھے۔اس حال میں ان کو ''صاحب عالم'' وہ لوگ بھی نہ کہتے تھے جو ان کے نسب سے واقف تھے۔چنانچہ وہ جیتے جی ''مرزا جی'' ہی پکارے گئے اور ان کے لڑکے مرزا سہراب شاہ تو مرزا جی بھی نہ رہے۔بگڑ کر مجی بن گئے۔کبھی کبھار کوئی وضعداری کا مارا انھیں مرزا جی کہہ کر مخاطب کرتا تو مجی کھل اٹھتے۔

بہادر شاہ کے پوتے کا حسب نسب:

میانہ قد، دوہرا بدن، کالا بھٹ رنگ، موٹی ناک، لال لال آنکھیں، پھیلا ہوا دہانہ، جھکی ہوئی مغلئی موچھوں کے سوا وہ اپنے چہرے مہرے سے مغل بالکل نہ لگتے تھے مگر ان کے حسب نسب پر شبہ کبھی نہیں کیا گیا۔کیا بھی کیسے جاتا۔دنیا جانتی تھی کہ محل سرا میں خیر سے کرہ قاف کی پریاں بھی تھیں اور افریقہ کی حبشیں بھی۔پھر کیا عجب تھا کہ اوپر کی کسی پشت میں مجی کا ننھیالی رشتہ حبشہ سے رہا ہو اور اس نے رنگ اب دکھایا ہو۔

شاہ زادے کے خاندانی شوق:

مجی کو اپنے بزرگوں سے اور کوئی ورثہ ملا ہو یا نہ ملا ہو۔زندگی کی اچھی چیزوں کی قدر کرنا اور ان سے لطف اٹھانا انھیں خوب آتا تھا۔شعر وسخن سے بڑی دلچسپی تھی۔افسوس ان کا کوئی شعر محفوظ نہیں رہ سکا۔پڑھے لکھے نام کو نہ تھے۔مگر شعر پڑھنے اور اس سے زیادہ شعر سننے اور داد دینے کا شوق تھا۔لوگ ان کی غزلوں کو لے پالک بتایا کرتے تھے۔لیکن مجی نے کبھی اس پر ملال کا اظہار نہیں کیا۔ناچ گانے کے بھی بڑے رسیا تھے۔ناممکن تھا کہ پاس پڑوس میں کہیں مجرا ہو یا سانگ ہو اور مجی صاف ستھرا کرتا پاجامہ واسکٹ پہنے اور دلی والوں کی گول ٹوپی اور وہاں

موجود نہ ہوں۔ سینما آیا تو اس کی خاطر وہ دس دس میل پیدل سفر کرنے لگے کہ اس زمانے میں رات کے وقت بستی حضرت نظام الدین اور دہلی شہر کے درمیان کوئی عام سواری نہ ملتی تھی۔

اس عہد کی معاشرت:

مجّی نے مزاج لڑکپن سے عاشقانہ پایا تھا۔ ابھی ان کی پہاڑ دا[1] کھیلنے کی عمر تھی اور مسیں بھی پوری طرح نہ بھیگی تھیں کہ انھوں نے فقیر خاندان کی ایک نوجوان بیوہ سے پینگیں بڑھانی شروع کیں۔ دور وہ تھا کہ بستی اور محلے کے بڑے متفقہ اور مشترکہ طور پر سب کے بڑے سمجھے جاتے تھے۔ ان کے دل میں سب کا درد ہوتا تھا اور سب کی وہ خیر خبر رکھتے تھے۔ چنانچہ مجّی کا کورٹ شپ بھی زیادہ دن تک ان کی عقابی نظروں سے اوجھل نہ رہ سکا۔ اور بستی کے چند بزرگوں نے کسی سہانے وقت انھیں محبوبہ سمیت پکڑ بلوایا۔ زنا نے مکان میں محبوبہ پر کیا بیتی یہ تو کم لوگوں کو معلوم ہوا۔ البتہ مردانے میں مجّی کو مرغا بننے کا تماشا بہت سے لوگوں نے دیکھا۔ مجّی کی قسمت اچھی تھی کہ ادھر سے حضرت خواجہ حسن نظامیؒ کا گزر ہو گیا۔ انھوں نے ۱۸۵۷ء پہ کتابیں ہی نہیں لکھی تھیں۔ مصیبت زدہ شاہی خاندان کی امداد میں بھی پیش پیش رہے تھے۔

شاہ زادے مرغا بنائے گئے: عاشقی قید شریعت میں لائی گئی

خواجہ صاحب نے پہچان لیا کہ جس لڑکے کو مرغا بنایا گیا ہے وہ مرزا ولایت شاہ کا بیٹا اور حضرت بہادر شاہ ظفر کا پوتا ہے۔ انھوں نے مجّی کے مقدمے میں فوری مداخلت کی اور زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ مجّی اپنی محبوبہ سکینہ کو نکاحاً بیوی بنائے حیران پریشان کھڑے تھے کہ اس نیک بخت کو کہاں لے جا کر رکھوں اور کس گھر سے کھلاؤں۔ یہ افتاد اور مشکل بھی۔ خواجہ صاحب ہی نے آسان کی اور اپنے گھر کی ایک کوٹھڑی کو دل پھینک شہزادے کا حجلۂ عروسی بنوا دیا۔ دونوں وقت کھانا بھی دولہا دلہن کے لیے جانے لگا۔ رفتہ رفتہ مجّی نے گھر کا سودا سلف لانے کا کام سنبھال لیا جس کا معاوضہ ان کو اپنے حق سے زیادہ ملتا تھا۔ مگر یہ مجّی کی سعادت مندی تھی کہ انھوں نے بیوی سے روٹی سالن پکانا سیکھ لیا اور معمولی گھریلو ملازم سے ایک درجہ ترقی کر کے باورچی اور خانساماں بن گئے۔ اس سے زیادہ کی ان کو ہوس بھی نہ تھی۔ چنانچہ باقی زندگی کھانا پکاتے، میز سجاتے گزار دی۔

باورچی شاہزادے امراء حیدرآباد کے جھرمٹ میں:

حضرت خواجہ نے مجّی کو آگے بڑھانے کی بہت کوشش کی۔ مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ترقی کا حصہ ان کے نامور اجداد اپنی اولاد کی تقدیر کا بھی پیشگی وصول کر چکے تھے اور اب مجّی کی قسمت میں کچھ بھی نہ تھا جسے وہ حاصل کرتے۔ خواجہ صاحب انھیں حیدرآباد لے گئے۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد نے خواجہ صاحب کی دعوت کی اور حیدرآباد کے سارے اکابر اور امراء کو جمع کیا تو خواجہ صاحب نے مجّی کو میز پر اپنے برابر بٹھایا۔ حیدرآباد کے نوابی ماحول میں

یہ منظر قیامت سے کم نہ تھا۔ مہاراجہ ضبط نہ کر سکے اور پوچھ ہی بیٹھے کہ آپ کے برابر جو شخص بیٹھا ہے کیا آپ کا ملازم ہے؟ خواجہ صاحب نے مختصر سا جواب دیا کہ جی ہاں میرا باورچی ہے۔ تھوڑی دیر بعد انھوں نے پھر کہا کہ اس کو پاس بٹھانے میں کوئی مصلحت ہوگی۔ خواجہ صاحب اس دفعہ بھی ایک فقرے کا جواب دے کر چپکے ہو گئے کہ ''جی ہاں مصلحت ہے''۔

باورچی کو مجلس امراء میں بٹھانے کی مصلحت:

تیسری دفعہ جب مہاراجہ نے اس مصلحت کی تفصیل پوچھی تو خواجہ صاحب کھڑے ہو گئے اور میز پر بیٹھنے والے امراء و روسا کو مہاراج سے اپنی گفتگو کا حال سنایا اور کہا کہ اپنے باورچی کو پاس بٹھانے کی مصلحت سے میں صرف اپنے میزبان ہی کو نہیں آپ سب کو بھی آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔ یہ وہ شخص ہے کہ اگر اس کا اچھا وقت ہوتا تو یہ لال قلعہ دہلی کے تخت کو زینت بخشتا اور مہاراجہ بہادر تو خیر ایک وزیر ہیں۔ ان کے ولی نعمت اعلاحضرت نظام دکن دہلی جاتے تو اس کے ایک صوبیدار کی حیثیت ہی سے جاتے اور اس کی مرضی تھی کہ انھیں شرف بازیابی بخشتا یا نہ بخشتا۔ لیکن آج زمانے کے انقلاب نے اسے ایک معمولی باورچی بنا دیا ہے اور سب کی پیشانیوں پر بل ہیں کہ ایک معمولی نوکر فلاں جنگ اور فلاں دولہ کے پاس کیوں بٹھایا گیا۔

حیدرآباد کے نوابوں کو تو اس واقعے سے یقیناً عبرت ہوئی ہوگی۔ مگر مجّی ہر عبرت اور آج اور کل کے ہر قصے سے بے نیاز تھے۔ انھیں بالکل یاد نہیں آتا تھا کہ وہ کیا تھے اور کیا ہو گئے۔ ایک دوسرا واقعہ ہے کہ مشہور انگریز مصنف ایسٹ براؤن دہلی آیا تو خواجہ حسن نظامی صاحب سے بھی ملا اور ان سے ۱۸۵۷ء کی کوئی ایسی کہانی سننے کی فرمائش کی جو چھپی نہ ہو اور جس کو وہ انگریزی میں لکھ سکے۔ خواجہ صاحب نے اس انگریز مصنف سے کہا کہ آپ کہانی صرف سننا چاہیں گے یا اس کو دیکھنا بھی پسند کریں گے؟ وہ سراپا اشتیاق بن کر بولا کہ کیا آپ کہانی دکھا بھی سکتے ہیں؟ اگر ایسا ہوا تو میں اپنے آپ کو بڑا خوش قسمت سمجھوں گا۔ خواجہ صاحب نے فوراً مجی! مجی! کہہ کر آواز دی اور ایک آدمی آٹا گوندھتے گوندھتے سامنے آ کھڑا ہوا۔ خواجہ صاحب نے مجّی سے کہا کہ صاحب کو سلام کرو اور صاحب سے تعارف کرایا۔ یہ میرا باورچی ہے!

بہادر شاہ کے مزار پر پوتے کی بے حسی:

صاحب نے حیرت سے پوچھا کہ آپ نے تو کہانی دکھانے کو کہا تھا۔ آپ مجھے اپنے باورچی سے کیوں ملاتے ہیں؟ میں کچھ سمجھا نہیں۔ خواجہ صاحب نے کہا ذرا صبر کیجیے۔ ابھی سمجھ میں آ جائے گا۔ یہ باورچی ہی کہانی ہے۔ یہ بہادر شاہ ظفر کا پوتا ہے۔ میں اس کو اس کے دادا کی قبر پر رنگون لے گیا۔ میں وہاں کھڑا روتا رہا۔ مگر اس نے نہ فاتحہ پڑھی نہ اس کی آنکھوں میں میں نے نمی دیکھی۔ جب مجھے وہاں روتے روتے بہت دیر ہو گئی تو یہ میرے قریب آیا اور رازداری سے کہنے لگا میاں! میں نے سینما کا ٹکٹ لے لیا تھا۔

شو کا وقت جا رہا ہے۔ اگر اجازت ہو تو میں واپس چلا جاؤں! تو جناب مجھے یہی کہانی آپ کو دکھانی تھی کہ جو کام آپ کی توپیں اور بندوقیں اور سنگینیں نہ کر سکیں وہ آپ کے سینما نے کر دکھایا۔ اس شخص کو اپنی عظمت رفتہ کا احساس ہونا چاہیے تھا۔ اس کی واپسی کے لیے اسے جد و جہد کرنی چاہیے تھی مگر اسے کچھ یاد نہیں رہا ہے۔ اس نے خود کو آپ کے سینما میں گم کر دیا ہے۔

نوکر کا بچہ آقا زادوں کا صدر بن بیٹھے:

انگریز مصنف کا تاثر جو کچھ بھی رہا ہو۔ لیکن حیرت اس پر ہوتی تھی بار بار جتائے جانے کے باوجود مجّی کو یاد نہ آتا تھا کہ وہ کیا ہیں؟ ان کا چھوٹا لڑکا مرزا حیدر شاہ میرا ہم عمر تھا۔ ہم ساتھ کھیلا کرتے تھے۔ بچے اپنے اطراف ہونے والے واقعات کی نقل بھی کھیل کھیل میں کیا کرتے ہیں۔ چنانچہ ہمارا ایک دلچسپ مشغلہ یہ تھا کہ اپنے گھر میں ہونے والی دعوتوں، پارٹیوں کی نقل کیا کرتے۔ دفتر قائم کرتے جھوٹ موٹ اخبار نکالتے، کتابیں چھاپتے، ممکن ہے خواجہ صاحب نے اپنے کسی اخبار نویس دوست کی مشکل آسان کرانے کے لیے اسی زمانے میں دہلی کے انگریز ڈپٹی کمشنر کی دعوت کی ہو۔ ہم لوگ اس کی نقل کر رہے تھے، کوئی بچہ خواجہ حسن نظامی بنا تھا۔ کوئی عزیز حسن بقائی، علی ہذا القیاس مجّی کے لڑکے مرزا حیدر شاہ کے حصے میں ڈپٹی کمشنر بننا آیا تھا اور وہ میز کے صدر مقام پر بڑی تمکنت سے بیٹھے تھے۔ پارٹی زور شور سے جاری تھی کہ مجّی خدا معلوم کہاں سے آ ٹپکے۔ کچھ کہے سنے بغیر انھوں نے اپنے لڑے حیدر کا کان پکڑا اور اتنے زور سے اسے اوپر اٹھایا کہ وہ بے چارہ ایک آنکھ بند کیے دوسری میں اپنے سارے کرب کو سمیٹے اسپرنگ کی طرح کرسی سے اٹھتا چلا گیا۔ سب بچے کورس میں چیخے، مجّی مجّی کیا کرتے ہو۔ ان کا کان نہ پکڑو، یہ تو ڈپٹی کمشنر ہیں، مگر مجّی نے ایک نہ سنی اور اس بے چارے کو گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے۔ بچوں نے خواجہ صاحب سے فریاد کی۔ مجّی کی طلبی ہوئی مگر انھوں نے بہت کھسیا کر اور کسی قدر مگر گلوگیر ہو کر اپنی صفائی میں بس یہ کہا کہ میاں! مجھے اچھا نہیں لگا کہ نوکر کا بچہ آقا زادوں کا صدر بن کر بیٹھے۔

شاہزادہ اچھا نوکر بننے میں مصروف ہو گیا:

مجّی اپنی نوکری میں بڑے مگن رہتے تھے۔ ان کی ساری صلاحیتیں ایک اچھا نوکر بننے میں صرف ہو گئیں۔ کھانے پینے کے ذوق اور عادتوں کے سلسلوں میں انھوں نے گھر کے ہر فرد اور روزمرہ کے مہمانوں کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ مثلاً انھیں معلوم تھا کہ کون کتنا پانی پیتا ہے، اس مناسبت سے وہ پانی کا کٹورہ یا گلاس سامنے رکھتے۔ مگر اس سلسلے میں کبھی کبھی ان کی ظرافت کا اظہار بھی ہوتا۔ ایک دفعہ علامۂ اقبال یا اور کوئی معزز پنجابی مہمان دسترخوان پر تھے اور ان کے برابر ایک دھان پان لکھنوی تشریف فرما تھے۔ مجّی نے گھر کا سب سے بڑا تانبے کا کٹورہ پانی سے لبالب بھر کر لکھنوی مہمان کے سامنے رکھا اور ایک چھوٹا سا نازک بلوری گلاس بقدر بادہ پنجابی مہمان

D:\Raf\Urooj wa Zawal

کو پیش کیا۔ دونوں مہمانوں نے اس مذاق سے لطف لیا اور مجّی کو داد دی۔ مگر مجّی اس طرح کا مذاق ہر ایک سے نہیں کرتے تھے۔ حفظ مراتب اور رکھ رکھاؤ ان کے مزاج کا حصہ بن گئے تھے۔ مذاق مجّی اسی سے کرتے جس کو بے تکلف جانتے۔ خواجہ صاحب کے ایک ایسی ہی دوست ولی محمد مومن سابق چیف منسٹر ریاست جوناگڑھ تھے۔ مجّی کو معلوم تھا کہ وہ شیعہ ہیں۔ ان کو مجّی نے اس طرح چھیڑا کہ میزبان اور مہمان دونوں کی پلیٹوں میں روٹی کو چار چار ٹکڑے کر کے رکھا۔ مومن صاحب بڑے مزے کے آدمی تھے۔ فوراً سمجھ گئے اور خواجہ صاحب کی پلیٹ میں سے روٹی کا ایک ٹکڑا اٹھا کر اپنی پلیٹ میں رکھا اور مجّی کی طرف فاتحانہ نظروں سے دیکھ کر بولے مرزا جی میرے تو پانچ پورے ہیں اب آپ اپنے تین ادھوروں کو لیے بیٹھے رہیے۔

لال قلعہ میں بے کاری کے مشغلے:

لال قلعے میں بیکاری کے مشغلے طرح طرح کے تھے انہی میں ایسے مقررہ فقروں کی ایجاد بھی ایک مشغلہ تھا جو خاص خاص موقعوں پر بولے جاتے تھے۔ بعض دفعہ، فقرے بامعنی اور بلیغ ہوا کرتے تھے اور بعض دفعہ لیمل، لال قلعے کی جھلکیاں دکھانے والوں نے ان کا تذکرہ کیا ہے۔ مجّی کی زبان پر بھی اس طرح کے فقرے اکثر آتے۔ خدا معلوم یہ انھوں نے اپنے بزرگوں سے سن رکھے تھے یا خود ایجاد کیے تھے۔ مثلاً ان سے پانی مانگا جاتا تو جواب میں جی اچھا، بہت اچھا یا ابھی لاتا ہوں کہنے کے بجائے کہا کرتے ''آنکھوں میں'' اب اللہ جانے اس کا مطلب نین کٹورے ہوتا تھا یا یہ بسر و چشم کا ایجاد بندہ قسم کا ترجمہ تھا۔ میری سمجھ اس وقت ایسی نہیں تھی کہ جرح کر کے اس کا اور بعض دوسرے فقروں کا مطلب ان سے پوچھتا۔

قلعہ کا ایک مشغلہ داستان گوئی:

مجّی کو بے شمار کہانیاں یاد تھیں۔ شام ہوتے ہی گھر کے اور پڑوس کے بچے ان کے پاس باورچی خانے میں جمع ہو جاتے اور مجّی کی داستان گوئی کا آغاز ہوتا۔ بیڑی کے کش پر کش لیتے جاتے اور اگلے وقتوں کے بادشاہ زادوں اور بادشاہ زادیوں کی کہانیاں سناتے رہتے۔ ایک ایک کہانی کئی کئی نشستوں میں پوری ہوتی۔ جزیات بڑی تفصیل سے بیان کی جاتیں، کھانے، زیور اور لباس تو فہرست بنانے کے لائق ہوتے۔ مگر عجیب بات یہ تھی کہ انھوں نے مغل دربار غدر اور لال قلعے کا اپنی کہانیوں میں کبھی تذکرہ نہیں کیا۔ نہ کبھی ہم نے ان سے بہادر شاہ ظفر کا نام سنا حالانکہ یہ داستان بھی ان تک بزرگوں سے ضرور پہنچی ہوگی۔ شاید اس ذکر سے انھیں تکلیف ہوتی ہو اور وہ اس آشیانے کا ذکر پسند نہ کرتے ہوں جس پر ابھی کل ہی بجلی گری تھی۔ ساری خود فراموشیوں کے باوجود یہ احساس عجیب احساس تھا اور اس سے عجیب تر احساس یہ تھا کہ آزادی کی جدوجہد اپنے عروج کو پہنچی اور اس کے فوراً بعد پاکستان کی تحریک شروع ہوئی تو مجّی گویا اپنے Hibernative اور ایک طویل نیند سے یکا یک جاگ اٹھے۔

دلی مجّی کے دل میں بسی ہوئی تھی:

ہمارے ہاں اہم لوگوں کا میلا لگا رہتا تھا۔ مجّی ان سب سے اس موضوع پر گفتگو کرتے۔ انھیں اس وقت کے سیاسی رجحانات سے سخت تشویش تھی۔ اس کا اظہار وہ اکثر کرتے۔ شاید ان کی چھٹی حس ان کو بتا رہی ہو کہ پاکستان بن گیا تو انھیں بھی وہاں جانا پڑے گا۔ دلی پیاری کو چھوڑنا ہوگا۔ دلی کے میلے ٹھیلے ان کو ایسے عزیز تھے کہ ان کی خاطر وہ کئی دفعہ نوکری تک چھوڑنے کو تیار ہو گئے۔ مہاراجہ کشن پرشاد والی دعوت نے انھیں حیدرآباد کے ایک وظیفہ سے نواز دیا تھا جو انھیں ریاست کے زمانے تک ملتا رہا۔

بہادر شاہ کے پڑپوتے چپراسی بن گئے:

۱۹۴۸ء میں اپنی بیوی کے مجبور کرنے سے وہ پاکستان چلے گئے وہاں ان کی دونوں لڑکوں مرزا سکندر شاہ اور مرزا حیدر شاہ کو غالباً چپراسی کی نوکریاں مل گئی تھیں لیکن اپنے بچوں کی کمائی سے وہ اپنے آپ کو خوش اور مطمئن نہ رکھ سکے۔ ۱۹۵۹ء میں کراچی کے سفر کے وقت میں ان سے ملا تو خوب روئے کہتے تھے مجھے دہلی لے چلو۔ میں دلی جا کر مرنا چاہتا ہوں، بچوں کے پاس مجھے ہر طرح کا آرام ہے مگر چین اور راحت مجھے ایک لمحے کو بھی میسر نہیں آئے ہیں۔ دلی کی جدائی مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔

دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں:

مجّی کو میں اپنے ساتھ دلی لے آتا۔ لیکن پاسپورٹ کی پابندی رکاوٹ بن گئی۔ ان کی مٹی کراچی ہی کی تھی۔ اپنے پردادا حضرت بہادر شاہ ظفر کی طرح مجّی کو بھی کوئے یار میں دو گز زمین نہ مل سکی۔ ۱۹۶۱ء میں ان کی موت کی اطلاع پہنچی بھی تو تین مہینے بعد دلی پہنچی اور کوشش کے باوجود تاریخ انتقال معلوم نہ ہو سکی۔

سدا رہے نام اللہ کا۔

حوالہ:

[۱] پہاڑ دا ایک دیہاتی کھیل تھا اور بجلی آنے سے پہلے صرف اندھیری راتوں میں کھیلا جاتا تھا۔ دو دو لڑکے اندھیرے میں الگ الگ آبادی سے دور نکل جاتے۔ اور ایک پارٹی دوسرے کو ڈھونڈتی اور ہر پارٹی کے لیے یہ ضروری ہوتا کہ پہلی کے اتے پتے کی طرح تھوڑے تھوڑے وقفے اور فاصلے سے بآواز بلند پہاڑ دا کی آواز لگائے اور دوسری پارٹی اس آواز پر اس کو پکڑنے کے لیے اندھیرے ہی میں دوڑے۔ سنسان زمانے کی سنسان راتوں کا یہ کھیل جو ذرا جی داری چاہتا تھا جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے لڑکے ہی کھیلا کرتے تھے۔